حکیم محمود احمد ظفر

مقالۂ خصوصی
قسط نمبر۵

جمہوریت ایک فتنہ اور فراڈ

وہ بااختیار ہوتے ہوئے بھی بے اختیار ہوتے ہیں۔
(Herald Laski : The crisis of Democracy P:42)

جموں کے فیصلوں پر سیاسی اور ذاتی میلانات اور رجحانات ہی اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات دولت کا لالچ بھی انھیں راہ عدل و انصاف سے رو گردانی کرا دیتا ہے۔ جمہوری سماج اور معاشرہ میں چونکہ دنیوی جاہ و جلال اور مادی عظمت و حشمت اور وقتی فوائد و لذائذ ہی کو زندگی کا بہترین سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ لہذا عدلیہ کے افراد بھی اسی سماج کا حصہ ہوتے ہوئے اس سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ وہ بھی اسی دنیا کی مخلوق ہوتے ہیں۔ آسمانی چمک دمک دیکھتے ہیں۔ ان کے دل میں بھی امیر بننے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ ان کا دل بھی چاہتا ہے قیمتی کاروں پر سفر کریں۔ مزید برآں جمہوری سماج کے غلط کار لوگ جو برسر اقتدار ہوتے ہیں یا جن کا برسر اقتدار لوگوں کے ساتھ سیاسی یا ذاتی تعلق ہوتا ہے، یا معاشرہ کے وہ لوگ جن کا مقصود زندگی ہر جائز ناجائز طریقہ سے دولت سمیٹنا ہوتا ہے، ان کو ہر وقت لالچ (Temptation) دیتے رہتے ہیں، لہذا وہ ان حقیر اور وقتی نمائندوں کے لئے بے گناہ لوگوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کر دیتے ہیں یا گناہ گار لوگوں کو ان کے ناجائز حقوق دلوا دیتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ماہر سیاسیات وسکاؤنٹ برائس (Viscownt Bryce) نے لکھا ہے:

"بداخلاقی کے تمام مظاہر میں سے عدلیہ کی بددیانتی سب سے زیادہ نفرت انگیز ہے۔ کیونکہ وہ غریب اور امیر کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے (جمہوری ریاست ہوتے ہوئے) فرانسیسیوں کو اپنی عدالتوں پر کوئی اعتماد نہیں رہا۔ اور امریکہ جیسے جمہوریت کے علمبردار ملک میں بعض جگہوں پر ایسے جج صاحبان موجود ہیں جن کے انتخاب میں یا تو سیاست دانوں کا دخل ہے یا پھر بڑے بڑے صنعتی اداروں کا۔ امریکہ کے بعض شہروں میں بڑے بڑے وکلاء بھی عدالتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

جموں کی رائے میں تبدیلی کے طریقوں میں بھی اچھی خاصی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ اب رشوت ستانی کے ایسے عمدہ طریقے ایجاد ہو گئے ہیں جن پر کوئی شخص شک نہیں کر سکتا۔ اب ججوں کے سامنے سونے اور چاندی کے ڈھیر نہیں لگائے جاتے بلکہ ان کو کسی ذریعہ سے صرف اتنی اطلاع دینا کافی ہوتا ہے کہ اگر وہ فلاں مقدمہ ان کی مرضی کے مطابق کر دیں تو فلاں فلاں کمپنی میں بغیر سرمایہ لگائے انہیں اتنے حصص کا مالک بنا دیا جائے گا۔"

(Viscount Bryce : Modern Democracies, P.28)

شاید یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں انصاف کوئی ارزاں چیز نہیں رہی بلکہ اقتدار کی اس مارکیٹ

میں یہی سب سے قیمتی چیز بن گئی ہے۔ اور اسے صرف اور صرف وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کی جیبیں مال و دولت سے بھری ہوئی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ غریب لوگ مظلوم اور ستم رسیدہ ہونے کے باوجود صرف جیب میں دولت نہ ہونے کی وجہ سے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتے۔

امریکہ جیسے جمہوری ملک میں چند سال قبل روزن برگ (Rosen Bergs) اور مسز روزن برگ کو عدالت نے جس دباؤ کے تحت موت کا حکم سنایا اس نے عدلیہ کی آزادی کا پول کھول دیا۔ صرف اور صرف اقتدار پر قابض طبقہ کے ایماء پر موت کا حکم سنایا گیا حالانکہ اتنی بڑی سزا کے لئے جو شہادتیں پیش کی گئیں وہ بالکل ناکافی تھیں جیسا کہ اس جیوری کے ممتاز رکن جسٹس جیوٹ (Gouitt) نے اس حقیقت کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے۔

چونکہ حکمران طبقہ اس میاں بیوی کے خون میں ہاتھ رنگنے پر تلا ہوا تھا اور اسی میں ان کا ذاتی مفاد تھا اس وجہ سے اگرچہ ان کی اس سزا پر احتجاج بھی ہوا۔ فیصلہ میں اختلافی نوٹ بھی لکھا گیا لیکن جیوں کی اکثریت نے اس کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ بعد میں جب ایک جسٹس ڈگلس (Dougles) نے دلائل اور شہادتوں کے کمزور ہونے کی وجہ سے دوبارہ مقدمہ چلانے کی اجازت دی تو جمہوریت کے جاں نثاروں اور پرستاروں نے واویلا اور شور مچانے کے ساتھ ساتھ جج کو مواخذہ (Impechment) کی دھمکی تک دی۔ لہذا جمہوریت میں عدلیہ کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔

۱۶۔ جمہوریت میں نہ صرف عدلیہ اور مقننہ کی آزادی ختم ہو جاتی ہے بلکہ انتظامیہ بھی پبلک کے نمائندوں کے بے جا دخل اندازی پر مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے، کیونکہ مفاد پرست سیاسیین کا یہ ٹولہ اپنے اور اپنے حواریوں کے مفادات کی خاطر انتظامیہ کے معاملات میں دخل انداز ہوتا رہتا ہے۔ وہ اپنے مفادات کی خاطر ان کی آراء پر ہر وقت اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور وہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اور اگر وہ ان کا اثر قبول کریں اور قانون کے مطابق جو کہ ان کا خود اپنا بنایا ہوتا ہے کام کریں تو وہ رائے عامہ کو ان کے خلاف ابھار دیتے ہیں۔ اور انتظامیہ کا وہ افسر بیچارہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کی بات مان لیتا ہے اور اگر پھر بھی نہ مانے تو اپنی کرسی سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، لہذا وہ اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ ان بے ضمیر نمائندوں کی مرضی کے مطابق کام کرے۔

انگلستان جو جمہوریت کا سب سے بڑا علم بردار ہے، وہاں کے نمائندوں نے وہاں کی انتظامی مشینری کو بری طرح برباد کیا ہے۔ چنانچہ مشہور دانشور اور سیاست دان مسٹر جلیس بار کر نے ان الفاظ میں اس حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے۔

"انگلستان اب ایک نہایت وسیع کاروبار ہے جس کو چند جاہل اور جھگڑالو منتظمین اپنی اپنی خواہشات اور مرضی کے مطابق چلا رہے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی ایسا نہیں رہا جو ان جاہل ناتجربہ کار لوگوں کی راہ نمائی کر سکے۔ انہیں لوگوں کے کام سے کوئی غرض نہیں بلکہ ان کی ساری دلچسپیاں صرف اسی ایک بات پر مرکوز

ہیں کہ کسی نہ کسی طرح وہ ان عہدوں پر قابض رہیں۔

(Hearnshow: Democracy on the crossway, P.22)

یہی حال پاکستان اور دوسرے جمہوری ممالک میں ہے۔"

۱۷- جمہوریت بددیانتی کو فروغ دیتی ہے اور اس کا ہر نمائندہ بددیانتی اور فریب دہی کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔ چنانچہ انتخابات سے قبل آئندہ انتخاب کے لئے اپنی مرضی کے مطابق حلقہ بندی کروائی جاتی ہے تاکہ حریف کو نقصان پہنچایا جا سکے۔ فہرستوں کی تیاری بھی چونکہ مسند اقتدار پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی ذمہ داری ہوتی ہے لہذا ان علاقوں میں جہاں انہیں کامیابی کی امید ہوتی ہے جعلی ووٹوں کا اندراج بکثرت کروایا جاتا ہے اور جس علاقہ میں کامیابی کی امید نہیں ہوتی وہاں فریق مخالف کے ووٹوں کا بہت کم اندراج کروایا جاتا ہے۔ جو کہ ایک بہت بڑی بددیانتی اور دھوکہ دہی ہے۔ گویا کہ الیکشن سے قبل ہی بددیانتی کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔

پھر الیکشن کے دوران صرف عوامی حمایت حاصل کرنے کے لئے عوام کے ساتھ ایسے وعدے کئے جاتے ہیں جن کا پورا کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ کبھی ہر کاشتکار کے لئے ۱۲ ایکڑ اراضی مہیا کرنے کا وعدہ کیا جاتا ہے اور کبھی روٹی کپڑا اور مکان کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ وعدہ کرتے وقت خود ان کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ وہ یہ وعدے پورے نہیں کر سکیں گے۔ لیکن صرف دھوکہ دہی اور فریب دینے کے لئے یہ وعدے کئے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں دوران الیکشن تمام اخلاقی اور دینی اقدار کو پامال کیا جاتا ہے۔ پھر حریف کی تذلیل و تحقیر کی جاتی ہے اور اس کی نجی زندگی کے جملہ عیوب تلاش کر کے سرعام اس کی تشہیر کی جاتی ہے۔ اس کی عزت کو سرعام نیلام کیا جاتا ہے۔ اس کے رازہائے دروں اور گناہ ہائے تاریک کو طشت ازبام کیا جاتا ہے تاکہ وہ رسوا اور بدنام ہو اور لوگ اس سے نفرت کر کے اسے ووٹ نہ دیں۔

بیشتر مقامات پر ووٹوں کی منڈی لگا کر انہیں خریدا جاتا ہے اور ان کے ضمیر کا زیادہ سے زیادہ قیمت پر سودا کیا جاتا ہے تاکہ اقتدار کے یہ بھوکے بھیڑیئے حکومت کے ایوانوں میں داخل ہو سکیں۔ پھر برسر اقتدار آنے کے بعد اس کاروبار پر لگا ہوا سرمایہ چند دنوں ہی میں کئی گنا کیا جاتا ہے۔

کئی دفعہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ فریق مخالف کو انتخاب کی منڈی کے یہ تھوک فروش اس کی بولی بھی لگا دیتے ہیں۔ گویا عوام کے ضمیر کو بکا جز معمولی کی طرح فروختنی شے بنا دیا جاتا ہے۔

الیکشن کے دوران ایسے گھناؤنے جرائم کئے جاتے ہیں کہ خود حیاء بھی سرپیٹ لیتی ہے۔ جیسے فریق مخالف کو اغواء کرانا، ووٹروں کو ڈرانا دھمکانا، جعلی ووٹوں کی بھرمار، ووٹوں کی گنتی میں عیاری اور بیلٹ بکسوں کی تبدیلی وغیرہ یہ وہ جرائم ہیں جن کی نہ اخلاق اجازت دیتا ہے اور نہ کوئی دین۔

۱۸- جمہوریت میں معاشرہ پر اس قدر برے اثرات پڑتے ہیں کہ پورا معاشرہ انسانوں کی بجائے

حیوانوں کا معاشرہ بن کر رہ جاتا ہے۔ سیاسی دھڑے بندی اور عداوت و منافرت تو وہ عام اثرات ہیں جو جمہوریت کی وجہ سے معاشرہ پر پڑتے ہیں۔ خود غرضی اور حُبِّ جاہ بھی جمہوریت کے ایسے جراثیم ہیں جو گھن کی طرح سماج کو کھا جاتے ہیں۔ جونہی الیکشن کا اعلان ہوا برساتی مینڈکوں کی طرح مختلف سیاسی پارٹیاں جنم لے لیتی ہیں۔ اور پورا سماج مختلف سیاسی دھڑوں میں بٹ جاتا ہے۔ دلوں میں عداوت و منافرت کے جراثیم تپ دق کے جراثیم سے بھی زیادہ خطرناک صورت میں پیدا ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ گھریلو زندگی بھی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ الیکشن کے بعد بھی دھڑے بندیاں اور عداوتیں پرورش پاتی رہتی ہیں۔

یہ تو باہر کی فضا کا حال ہے۔ اسمبلیوں کے فضا اور زیادہ مکدّر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسمبلیوں میں حزب اقتدار حزب اختلاف کی تنقید برداشت نہیں کرتا اور بسا اوقات اسمبلی میں مکوں اور کرسیوں سے جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جس سے اکثر اپوزیشن ہی پٹتی ہے کیونکہ ایک تو وہ کمزور ہوتی ہے اور دوسرے تعداد میں کم کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ PSF اور دوسرے غنڈے منگوا کر اپوزیشن کو باہر پھنکوا دیا جاتا ہے۔ جس میں باہمی تناؤ میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف حزب اختلاف حزب اقتدار کی پالیسیوں پر غیر ضروری تنقید کرتی ہے جو اسمبلی اور اسمبلی سے باہر کی فضا کو عداوت اور منافرت سے گدلا کر دیتی ہے۔

۱۸۔ جمہوریت سے ملکی معیشت پر بھی بہت برے اثرات پڑتے ہیں۔ الیکشن کے اخراجات جو کئی سو ملین ہوتے ہیں، ملکی معیشت پر ایک بہت بڑا بار ہوتے ہیں۔ پھر اسمبلی کے نمائندگان کے اخراجات جو کئی کروڑ تک تجاوز کر جاتے ہیں۔ ملکی معیشت کو خاصا برباد کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں الیکشن سے چند ماہ قبل اور چند ماہ بعد تک ملک کا تمام کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ کاروباری طبقہ اس بات سے بالکل بے خبر ہوتا ہے کہ کون سی پارٹی برسر اقتدار آئے گی اور اس کی اقتصادی پالیسی کیا ہو گی۔ اگرچہ ہر جماعت اپنا منشور پیش کرتی ہے لیکن وہ منشور صرف کاغذات تک رہتا ہے۔ برسر اقتدار آنے کے بعد اس کی پالیسی منشور سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ الیکشن کے جلسے اور جلوسوں کی وجہ سے کاروباری اخراجات کو کئی کئی ماہ اپنی دوکانیں بند کرنا پڑتی ہیں۔ اس سے بھی ملکی معیشت کو اچھا خاصا نقصان ہوتا ہے۔

الیکشن کے بعد جو نمائندگان اسمبلی میں پہنچتے ہیں وہ اپنے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے رشوت اور قومی خزانہ میں لوٹ مار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر انہوں نے ایک لاکھ خرچ کیا ہوتا ہے تو دس لاکھ کمانے یا بٹورنے کی ہوس رکھتے ہیں۔ پھر ان ممبران کا معاملہ صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اپنے ان کارکنوں کی خدمات کا معاوضہ بھی قومی خزانہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جنہوں نے الیکشن میں ان کے لئے کام کیا ہوتا ہے۔ ممبران کی یہ ساری لوٹ مار ملکی معیشت کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے۔

یہ تو ان ممبران کی اسمبلی سے باہر کی لوٹ مار ہے۔ جب یہ حضرات اسمبلی میں پہنچتے ہیں تو ان کی تنخواہیں اور الاؤنس قومی خزانہ پر مزید بار ڈالتے ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے مزید ٹیکس لگائے جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملکی معیشت تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی۔

۱۹۔ جمہوریت میں ملک کو سیاسی استحکام بھی نصیب نہیں ہوتا کیونکہ اس زمانہ میں جب تک اقتصادی اور معاشی استحکام نہ ہو اس وقت تک سیاسی استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام میں آئے روز وزارتیں اور حکومتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ برسر اقتدار پارٹی اگر آج ایک قانون بناتی ہے اور اگلے الیکشن میں اس کی بجائے جب دوسری پارٹی اقتدار پر قابض ہوتی ہے تو وہ ان کے بنائے ہوئے قوانین منسوخ کر کے اپنی مرضی کے قوانین بناتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جو کہ سیاسی استحکام پر برے اثرات ڈالتا ہے۔

بعض سیاسی لیڈر سستی شہرت کے لئے علاقائی اور صوبائی تعصب کو ہوا دیتے ہیں۔ اور اپنی تقاریر میں لوگوں کے دلوں میں مرکز کے خلاف یہ کہہ کر نفرت کے جذبات پیدا کرتے ہیں کہ مرکز آپ کے صوبے کا حق غصب کر رہا ہے۔ اس طریقے سے اگرچہ ان لیڈروں کی دوکانیں چمک جاتی ہیں لیکن ملی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

جب ملک میں سیاسی استحکام نہ ہو تو بیرونی خطرات کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے جو کہ ملک کی سلامتی کے لئے سب سے زیادہ نقصان دہ چیز ہے۔ دوسرے ممالک سیاسی طور پر غیر مستحکم ملک میں اپنا اثر و نفوذ حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر اس طریقہ سے حکومتوں کے تختے الٹے جاتے ہیں۔

ترقی پذیر ممالک اپنے وسائل کی کمی کے باوجود ترقی یافتہ ممالک کی سی تعیشانہ طرز زندگی اپنائے جا رہے ہیں۔ اور جب اپنے ملکی وسائل سے ان کا کام نہیں چلتا تو کاسہ گدائی لے کر ترقی یافتہ ممالک سے امداد (Aid) کی بھیک مانگتے ہیں۔ اب وہ ملک اس شرط پر امداد منظور کرتے ہیں کہ وہاں جمہوری پارلیمانی نظام کار فرما ہوتا کہ وہ اپنے پسندیدہ افراد آگے لا سکیں۔ گویا جمہوری نظام اور اقتصادی امداد ایسے پھندے ہیں جن کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ممالک کو اپنے پنجہ استبداد میں جکڑے رکھتے ہیں۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں ترقی پذیر ممالک میں جس وزیر اعظم کو امریکہ کی آشیر باد نہ ہو وہ دو ووٹوں کی اکثریت کے باوجود بھی وزیر اعظم نہیں رہ سکتا اور جو امریکہ کے چرنوں میں جا کر سجدہ ریز ہو جائے اور اس کی مرضی کے مطابق حکومت کرنے کا وعدہ کرے وہ دو ووٹوں کی کمی کے باوجود بھی وزیر اعظم بن جاتا ہے۔ پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک میں اس کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

ان سب باتوں سے معلوم ہوا کہ جمہوریت سے ملکی استحکام پیدا نہیں ہوتا۔ اور جو لوگ ملکی استحکام کے لئے جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں وہ جمہوریت کی روح سے ناواقف ہیں۔

یہ وہ چند دلائل تھے جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جمہوریت جس کا آج ساری دنیا میں چرچا اور شہرہ ہے خلاف اسلام، خلاف عقل اور خلاف فطرت نظام حکومت ہے۔ یہ مغرب کے عیسائی یا دوسرے سیکولر اور غیر مسلم ممالک میں تو چل سکتا ہے جن کے ہاں نہ دین کا کوئی پاس ہے اور نہ شرم و حیاء کا کوئی لحاظ۔ لیکن مسلمان سیکولر اور خصوصی طور پر نظریاتی اسٹیٹ میں یہ نظام حکومت نہیں چل سکتا۔ مغربی ممالک میں اگر جمہوریت

کے ذریعہ ہم جنسی اور جنسی بے راہ روی کو بھی سند جواز دے دی جائے تو ان کے ہاں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن مسلمان ملکوں میں ایسے گناہوں کو پنپنے نہیں دیا جا سکتا۔

بعض حضرات جمہوریت کے بارہ میں عوام کو ایک مغالطہ دیتے ہیں وہ یہ کہ جمہوریت عین اسلام ہے کیونکہ قرآن حکیم اور احادیث نبویہ میں مشورہ کی تاکید آئی ہے۔ اسمبلیاں بھی چونکہ مجلس شوریٰ ہی کی حیثیت رکھتی ہیں لہذا جب اسلام میں مشورہ ہے تو گویا جمہوریت بھی ہے۔

یہ بات سراسر مغالطہ ہے جو سادہ لوح لوگوں کو جمہوریوں کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اسلام میں مشورہ کی بہت تاکید ہے اور ہر خلیفہ راشد کی مجلسِ شوریٰ ہوتی تھی، لیکن اسلام میں مشورہ کے بارہ میں خلیفہ وقت کو پابند نہیں کیا گیا کہ وہ مجلس شوریٰ کے مشورہ پر ضرور عمل کرے۔ یہاں تک کہ خود نبوت کے مشورہ پر بھی عمل کرنے کی امت کو پابند نہیں کیا گیا۔ چنانچہ احادیث صحیحہ میں سیدہ بریرہؓ کا واقعہ مذکور ہے۔ وہ اپنے خاوند سیدنا مغیثؓ سے اپنے غلامی میں ہوتے ہوئے نکاح کو فسخ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے شوہر سیدنا مغیثؓ کو ان سے بڑی محبت تھی۔ انہیں سیدہ بریرہؓ کے فسخ نکاح کے فیصلہ سے بہت صدمہ ہوا۔ اسی صدمہ فراق میں وہ مدینہ طیبہ کے گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو ان کی اس حالت زار پر رحم آیا اور آپ ﷺ نے بریرہؓ کو بلا کر فرمایا کہ کیا ہی اچھا ہوا گر تم اپنے شوہر مغیثؓ سے رجوع کر لو۔ سیدہ بریرہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! یہ آپ ﷺ کا حکم ہے یا مشورہ؟ آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے۔ سیدہ بریرہؓ نے صاف عرض کیا یا رسول اللہ! اگر مشورہ ہے تو میں اسے قبول نہیں کرتی، حکم ہے تو سر آنکھوں پر چنانچہ سیدہ بریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے مشورہ پر عمل نہ کیا۔ نہ آپ اس سے ناراض ہوئے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے کوئی عتاب ہوا۔ اور بقول حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی:

"اس سے صاف یہ نتیجہ نکلا کہ جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔ پس

"وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ"

سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کر لیا کریں۔

مشورہ کی اس آیت پر جس میں رسول اللہ ﷺ کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرنے کا حکم ہے۔ مزید غور کریں تو مشورہ کی حقیقت عیاں ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ

آپ معاملات میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیجئے اور پھر جب آپ عزم کر لیں تو اللہ پر توکل کیجئے اس آیت میں

صحابہ کرامؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے مشورہ کرنے کا حکم فرمایا گیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ مشورہ کے بعد جب آپ کسی ایک جانب کا عزم فرمالیں تو پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس کام کو کر گذریں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اراکین شوریٰ کے مشورہ کے بعد کسی ایک جانب کو ترجیح دینا اور اس کا عزم کرنا یہ سربراہ مملکت کی رائے پر موقوف ہے۔ اگر مشورہ کا فیصلہ کثرت رائے پر موقوف ہوتا تو پھر عزم کے لئے بھی جمع کا صیغہ استعمال کر کے یوں فرمایا جاتا فاذاعزموا یعنی جب صحابہؓ کی اکثریت کسی جانب کا عزم کریں، لیکن آیت میں جمع کے بجائے مفرد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ سربراہ مملکت کی رائے پر موقوف ہے۔ سربراہ مملکت اپنی دیانت اور فہم سے جس رائے کو زیادہ صائب سمجھے اس کو نافذ کردے۔

رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ آپ نے مشورہ کے بعد موجودہ طرز پر نہ تو ووٹ لئے اور نہ آراء کو شمار کر کے ان کی کثرت پر فیصلہ کیا۔ حضور ﷺ کے انتقال کے بعد آپ کے خلفائے راشدین کا عمل بھی مشورہ کے بارہ میں نبوت کے عمل کے مطابق رہا۔ جس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

مشورہ کے بارہ میں بھی لوگوں میں بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مشورہ کا مطلب یہ ہے دوسرے پر اپنی رائے ٹھونسنا، حالانکہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ مشورہ کا مادہ (Roof) شور ہے جس کے معنی چھتہ میں سے شہد نکالنے کے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے مشورہ کے معنی ہیں دوسرے کے خیالات کا نچوڑ حاصل کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ اور اگر خود شہد سے مفہوم لیا جائے تو جس طرح شہد کی مکھیاں اپنی اپنی محنت کا ماحصل ایک جگہ جمع کر دیتی ہیں اسی مشاورت میں مختلف افراد معاشرہ کی اپنی اپنی رائے، فکر، خیالات اور غور و خوض کے نتائج کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں تاکہ اس سے کسی فیصلہ تک پہنچا جائے۔ روئی دھننے والے کی کمان کی ثابت کو الشوار کہتے ہیں۔ لہذا مشورہ کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے۔ آراء کو دھننا اور انھیں کھول کر نتیجہ نکالنا۔

لغت کی کسی کتاب میں مشورہ کے یہ معنی نہیں کہ اپنی رائے کسی پر ٹھونسنا۔ پھر معلوم نہیں کہ جمہوری ذہن کے لوگوں نے یہ کہاں سے سمجھ لیا کہ مشورہ کے معنی کثرت رائے کو قبول کرنا ہے۔ دراصل مشورہ کی حقیقت یہ ہے کہ زیر غور معاملہ کی تمام اطراف منافع اور مضار روشنی میں آجائیں اور پھر مشورہ لینے والا جس جانب کو اختیار کرے، علی وجہ البصیرت اختیار کرے، کیونکہ کئی دفعہ کسی معاملہ کے فوائد اور منافع ایک شخص کے ذہن میں ہوتے ہیں لیکن اس کے نقصانات اس کے ذہن میں نہیں ہوتے۔ جب مختلف حضرات ان امور کے بارہ میں مختلف قسم کی آراء پیش کرتے ہیں جن میں ان امور کے فوائد اور نقصانات، منافع اور مضاد دونوں بیان کئے جاتے ہیں اور اس معاملہ کا ہر پہلو واضح اور منقح ہو جاتا ہے تو اس سے مشورہ لینے والے کو ان امور کی ایک جانب کو ترجیح دینے کی قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے مشورہ کی اصل غرض وغایت جس

کی جمہوری ذہنوں نے اسلام میں جمہوریت کے جواز کی دلیل بنا لیا۔ حالانکہ جمہوری حکومت کی اسمبلیوں میں صرف مشورہ نہیں دیتے بلکہ کثرت رائے سے جو فیصلہ کرتے ہیں سربراہ مملکت یا وزیر اعظم اس فیصلہ کو ماننے پر مجبور ہے۔ ان اسمبلیوں کے مقابلہ میں ایک اسلامی حکومت میں سربراہ مملکت اگرچہ مجلس شوریٰ سے مشورہ لینے کا پابند ہے، لیکن ان کی اکثریت کی رائے کو ماننے یا نافذ کرنے کا پابند نہیں ہے۔ اس لحاظ سے جمہوریت حکومت کی پارلیمنٹ اور اسمبلی اور اسلامی حکومت کی مجلس شوریٰ میں بُعد المشرقین ہے، لہذا یہ کہنا کہ اسلام میں جمہوریت ہے نرا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلام میں کثرت رائے کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ اسلام میں صرف قوت رائے کی اہمیت ہے، خواہ وہ ایک آدمی کی رائے ہو۔ کیونکہ اختلاف رائے کی صورت میں کسی رائے کو قابل قبول اور قابل عمل قرار دینے کے لئے صرف دو احتمال ہیں۔

۱۔ قوت دلیل۔ ۲۔ کثرت آراء

لیکن اس بارہ میں اگر عقل و دانش سے کام لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اصل قابل ترجیح قوت دلیل ہے۔ کثرت آراء کو صحت رائے اور درستگی فیصلہ میں بذات خود کوئی دخل نہیں۔ ہاں بعض اوقات کثرت آراء قوت دلیل کی علامت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے بعض لوگوں نے اس کو قوت دلیل کا قائم مقام سمجھ کر اس کے مطابق فیصلہ دینا شروع کر دیا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسا جوہر بے بہا عطاء فرمایا ہے جو اس کو طیور و حوش، ملک و جن اور حیوانات سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا۔ وہ جوہر بے بہا اور گوہر تابدار عقل ہے۔ عقل ہی سے انسان کو دوسری تمام مخلوق پر ایک گونہ افضلیت اور فوقیت حاصل ہے۔ لیکن یہ عقل تمام افراد انسانی میں ایک جیسی نہیں۔ بلکہ اس میں بہت فرق ہے۔ بعض انسان تو اس درجہ عقل مند ہیں کہ رگ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں۔ اور بعض اس درجہ جوہر عقل سے عاری ہیں کہ وہ نام کے انسان ہیں۔ معنوی طور پر وہ حیوانیت اور غیر ذوی العقول میں داخل ہیں۔ یہ قضیہ بھی مسلمہ ہے کہ استنباط، استدلال، حقیقت شناسی، قیاس، معلومات سے مجہولات کا علم حاصل کرنا اور دلیل سے نتیجہ برآمد کرنا یہ سب اشیاء عقل پر موقوف ہیں۔ اور یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ تجربات عقل کو جلاء بخشتے ہیں، لہذا اس نتیجہ کو تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ کسی معاملہ کی حقیقت اور کنہ تک پہنچنا، دلائل اور نتائج کے سقیم اور صحیح میں امتیاز کرنا، ہر دعویٰ دلائل قویہ سے مدلل کرنا، یہ سب چیزیں وہی شخص کر سکتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل وافر عطاء فرمائی ہو اور اس کی عقل کی پختہ کاری تجربہ سے ہو چکی ہو۔

جب یہ تمام مسلمہ امور آپ کے ذہن میں آ گئے تو اب آپ ہی اپنی عقل کو حکم بنا کر اس بات کا فیصلہ دیجئے کہ اگر ایک طرف وہ شخص ہو جس کی عقل کامل اور تجربہ تام ہو اور دوسری طرف دنیا کے کل یا اکثر افراد جو عقل سے مکمل طور پر بے بہرہ یا عقل قلیل کے مالک ہو۔ ان دونوں میں کس کا فیصلہ قابل قبول

ہو گا؟ یقیناً اسی شخص کا جو عقل میں کامل اور تجربہ میں تمام ہو گا نہ کہ بے عقل اور ناتجربہ کار اکثریت کا۔ اسی چیز کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

یہ تو عقلی توجیہ تھی اس بارہ میں کہ بات قوت دلیل سے معتبر ہوتی ہے نہ کہ کثرت آراء سے۔ چنانچہ مشاہدہ سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک ہر قوم اور ہر دور کی تاریخ پر نظر ڈالیئے تو آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں اسی شخص کی اتباع کی گئی ہے جو ان کے ہاں سب سے زیادہ زیرک، دانش مند اور عقل و تجربہ کے اعلیٰ مراتب پر فائز تھا۔ کسی بے عقل، غیر دانش مند اور غیر تجربہ کار شخص کی آج تک کسی نے اطاعت اور اتباع نہیں کی۔ تاریخ عالم اس بات کی شہادت بھی دیتی ہے کہ بعض ایسے افراد بھی گزرے ہیں جو عقل و دانش اور تجربہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ان کی نہ صرف ان کی زندگی میں اتباع کی گئی بلکہ ان کے مرنے کے بعد بھی آنے والی نسلوں نے ان کے طریقہ پر چلنا اور ان کے اصولوں پر کاربند رہنے کو اپنے لئے موجب فخر سمجھا۔ اس بات کی ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں مثالیں سینۂ تاریخ پر نقش ہیں۔ چنانچہ ارسطو، سقراط، بقراط، بوعلی سینا اور امام غزالی وغیرہ انہیں لوگوں میں سے ہیں جن کے قائم کردہ اصولوں کو آج تک قابل اتباع سمجھا جاتا ہے۔

ان لوگوں کے قائم کردہ اصولوں میں اگر کسی صاحب عقل و فراست نے کچھ ترامیم کرنا چاہیں یا ان کے اصولوں کے بجائے دوسرے اصول قائم کرنا چاہے تو جب تک وہ اپنی عقل اور اپنے علم سے کوئی دلیل قوی ان کے خلاف قائم نہ کرے گا اور اپنے مشاہدات و تجربات سے جن سے استنزاج نتائج بھی عقل ہی کا کام ہے، سابق اصول و قواعد کے خلاف نہ دکھلا سکے گا کوئی شخص بھی اس کے قول کو تسلیم نہیں کرے گا۔ ان اصول و قواعد کو تسلیم کر کے سابق اصول و قواعد کو اگر کوئی چھوڑے گا تو صرف اسی بنا پر کہ اس مؤخر الذکر شخص کے عقل و تجربہ کو پہلے شخص کے عقل و تجربہ پر فوقیت حاصل ہے اور اس کی دلیل و محبت اس سے قوی اور اس کا مشاہدہ اور تجربہ اس سے زیادہ اور تام ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ بقول ارسطو اور دیگر عقلائے زمانہ

"دنیا میں ہمیشہ بے وقوف، احمقوں، جاہلوں اور ناتجربہ کاروں کی کثرت اور بہتات رہی ہے اور عقلاء، دانش ور اور عالم لوگ خال خال رہے ہیں۔ اس وجہ سے کثرت رائے کا فیصلہ اکثر حماقت، جہالت اور بیوقوفی کا فیصلہ ہوتا ہے"

اس بحث سے کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ شریعت میں کثرت رائے کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ اسلام نے کثرت رائے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ امام نماز کے

انتخاب میں نمازیوں کی کثرت رائے کو ترجیح دی۔ سربراہ مملکت کے انتخاب کا دارومدار بھی کثرت رائے پر رکھا۔ اجماع کی حجت کی بنیاد بھی کثرت آراء پر استوار کی۔ احادیث میں بھی کثرت طرق کو وجہ ترجیح بنایا گیا۔ لیکن کثرت رائے کو اسلام نے نہ تو ہر جگہ حجت و دلیل کو تسلیم کیا ہے اور نہ ہی ہر موقع پر اس کو نظر انداز کیا ہے۔ جمہوریت اور اسلامی نظام میں یہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے۔

یہ درست ہے کہ اکثریت کی تائید بھی ایک قوت اور طاقت ہے، لیکن جمہوریت نے اکثریت کی پرستش شروع کردی اور اس کو حق و باطل کا معیار بنالیا۔ اسلام میں حق و باطل کا معیار دلیل ہے نہ کہ ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت، لیکن جہاں دلیل کی نہیں بلکہ قوت کی احتیاج ہو یا دلائل میں ایسا تعارض ہو کہ عقل انسانی کسی ایک پہلو کو ترجیح دینے سے قاصر ہوجائے یا کسی بات کی تائید مقصود ہو وہاں کثرت رائے ایک دلیل کا درجہ رکھتی ہے جو ایک پہلو کو ترجیح دے دیتی ہے۔

یہ تھے وہ چند ایک دلائل جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت نہ صرف خلاف اسلام ہے بلکہ خلاف فطرت بھی ہے۔ آج اسی جمہوریت کو پاکستان میں نافذ کیا گیا ہے، اس پاکستان میں جس کو اسلامی نظام کے نافذ کرنے کے لئے گنایا گیا تھا اور لوگوں نے اپنے جان و مال کی قربانیاں دی تھیں۔ اگر جمہوریت کے لئے پاکستان بنایا تھا تو جمہوری نظام تو پہلے بھی تھوڑا بہت نافذ تھا۔ اسمبلی تو اس وقت تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ غیر اسلامی نظام حکومت نافذ کر کے اب اس کا بڑے زور شور سے چرچا بھی کیا جا رہا کہ پاکستان میں جمہوریت نافذ کردی گئی۔ ہر اسلامی اور غیر اسلامی پارٹی اس کا چرچا کر رہی ہے۔

علامہ اقبال جو پاکستان کے مفکر تھے اور مغرب کی جمہوریت کا انہوں نے بڑی گہری نگاہ سے مطالعہ کیا تھا، انہوں نے بھی اس جمہوریت کی سخت مخالفت کی تھی۔ چنانچہ علامہ فرماتے ہیں۔

متاع معنی بیگانہ اُدوں فطرتاں جوئی
زموراں شوخیٔ طبعِ سلیمانی نمی آید
گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد فکر انسانی نمی آید

ایک اور کتاب میں علامہ فرماتے ہیں:

اس راز کو اک مرد قلندر نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ایک اور مقام پر علامہ فرماتے ہیں

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایاتِ حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

(جاری ہے)

مولانا ابوریحان سیالکوٹی
سبائی فتنہ
(حصہ اول)
قیمت 150 روپے
اہل سنت کے روپ میں رفض و سبائیت
پھیلانے والے طبقہ کے خیالات کا
علمی و تحقیقی محاسبہ
ایسی کتاب جس نے بعض نام نہاد
تقدس مآبوں کی حجلہ عروسی میں
زلزلہ بپا کر دیا
بخاری اکیڈمی مہربان کالونی ملتان۔

بقیہ از صـ ١٩

ہوتا۔ اس لئے دین اور جہاد، روحانیت اور مادّیت دونوں سے مخلوط کر کے اس دین کو لایا گیا ہے۔ اس لئے ہر دینی حکم میں سیاست کی آمیزش ہے اور ہر سیاسی حکم میں دین کا خون رچا ہوا ہے۔ اس لئے احادیث میں بنیادی طور پر اس مادّیت وروحانیت کو عدیل بنا کر پیش کیا گیا ہے تاکہ ایک جانب میں منہمک ہو کر دوسری جانب سے انقطاع یا نہ پیدا ہو۔

"شانِ رسالت"
افادات حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ
صفحات ٦٦، ٦٧، ٦٨۔